

تیشۂ کرب

مرتضیٰ برلاس

تیشۂ کرب

مرتضیٰ برلاس

نیرنگِ خیال پبلی کیشنز
کالج روڈ، راولپنڈی (شہر)

بار دوم

تعداد: ایک ہزار
ناشر: سلطان رشک
کاتب: محمد حسین (شاہ)
سرورق: سلیمہ ہاشمی
مطبع: جنگ پریس راولپنڈی
قیمت: ۲۰ روپے

"چاند"

کے نام

ہزار ضبط کروں، لاکھ دِل کو بہلاؤں
مگر وہ شکل جو ہر روز خواب میں آئے

دُور تک سلسلۂ کوہِ شب و رُوز سہی
تیشۂ کرب اُٹھائے کوئی فرہاد بھی ہے

ترتیب

پیش کلام

مرتضیٰ برلاس کا ایک شعر ہے:

ہم ہیں فنکار، مقابر کے مورّخ تو نہیں
ہم کو ہوتا ہے جو محسوس وہ کیونکر نہ کہیں

اگر مرتضیٰ برلاس "تیشۂ کرب" میں اپنے صرف اس شعر کو بطور "پیش کلام" درج کرتا تو کسی دیباچے یا تمہید کی ضرورت نہیں تھی۔ اس ایک شعر میں اس کا نظریۂ فن اور نظریۂ حیات اتنی بلاغت سے سما گئے ہیں کہ آیندہ میں جو کچھ لکھوں گا، یوں سمجھیے کہ اس ایک شعر کی تشریح لکھوں گا۔

فن کار کی عصری آگہی اس کے منصب کا سب سے اہم مطالبہ ہے۔ اس آگہی کی برکت سے غالب اور اقبال اُردو کے عظیم شاعر ہیں ورنہ ان سے بہتر زبان لکھنے والے اور مروّجہ محاورہ و روزمرّہ کو اپنے اشعار میں سجانے والے سینکڑوں شعرا گزرے ہیں اور اپنے اپنے ادوار میں انھیں مقبولیت بھی حاصل رہی ہے، مگر یہ غالب اور اقبال ہی ہیں جو اپنے ادوار کی حدوں کو عبور کر گئے

ہیں - یہ سربر آورگی انھیں ان کی عصری آگہی نے بخشی ہے کہ وہ حقیقت پسند تھے اور حق گو تھے اور جس شاعری کے آسمان پر سچ کا آفتاب طلوع نہیں ہوتا وہ مر جاتی ہے - سچ کی کڑی دھوپ فن کو بالیدگی اور ارتفاع بخشتی ہے اور مرتضیٰ برلاس اپنے متذکرہ بالا شعر میں اسی سچ کی مشعل بلند کیے کھڑا ہے - اس کی غزل کا تمام تر سرمایہ یہی سچ اور صرف سچ ہے - اپنے عصر کے بارے میں سچ ، اپنی قوم کے بارے میں سچ ، اپنے وطن کے بارے میں سچ ، اپنی سیاست کے بارے میں سچ ، اپنی معاشرت کے بارے میں سچ ، اپنے ہم قلموں کے بارے میں سچ اور خود اپنے بارے میں سچ -

میں نے جب پہلی بار مرتضیٰ برلاس کو ایک محفل شعر میں غزل پڑھتے سُنا تو مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ اس بے حد میٹھے اور مہذّب انسان کو سٹیج پر جا کر یکا یک کیا ہو گیا ہے کہ اس کے تیور بدل گئے ہیں - اس کی آنکھوں میں شعلے سے بھڑک اُٹھے ہیں، اس کے اعصاب تن گئے ہیں ، اور وہ اہل محفل سے یوں مخاطب ہے جیسے انؔ کے ضمیروں کے راز فاش کرنے چلا ہے، ان کی ملمّع شدہ شخصیّتوں پر تیزاب چھڑکنے لگا ہے، اشعار کی صورت میں ان کے سامنے آئینے سجا رہا ہے کہ منافقت کا "میک اپ" دُھل جانے کے بعد ان میں اپنے چہرے دیکھو اور سوچو کہ تم نے اپنے انفرادی مفادات کے تنوروں کو کتنے اجتماعی مفادات کی آگ دے کر تپایا ہے اور تمھارے دانتوں میں خود تمھارے بھائیوں کے گوشت کے اٹکے ہوئے ریشے کس بھیانک انداز میں باہر لٹکے رہے ہیں - پھر میں نے سوچا کہ جس طرح بعض مترنم شعرائ کے کلام کے بارے میں ان کے ترنم کے سحر کی

وجہ سے کوئی فوری فیصلہ دشوار ہوتا ہے، اسی طرح بعض تحت اللفظ پڑھنے والے بھی کچھ ایسے ڈرامائی انداز میں اپنا کلام سناتے ہیں کہ ان کے اس اہتمام سے ان کے فن کا فوری تجزیہ دشوار ہو جاتا ہے، چنانچہ مرتضیٰ برلاس کے محض اندازِ شعر خوانی کے طلسم میں آ کر اس کی غزل کی توانائیوں کے بارے میں کسی خوش فہمی میں مبتلا ہو جانا غلط ہوگا۔ مگر جب میں نے برلاس کا وہی کلام مطبوعہ صورت میں پڑھا اور ایک ایک شعر کو رُک رُک کر پرکھا، تو مجھ پر انکشاف ہوا کہ برلاس دراصل ان گنے چُنے شعرا میں سے ایک ہے جو شعر یوں کہتے ہیں جیسے عبادت کرتے ہیں اور اسی لیے جب وہ اپنے اشعار سناتے ہیں تو ان پر من وعن وہی کیفیت وارد ہو جاتی ہے جو شعر کہتے وقت ان پر وارد ہوئی ہوگی۔

منافقت اور ریا اور تصنّع کی عادی دنیا کو سچ کا کڑوا ذائقہ چکھانا بڑے حوصلے اور جرأت کا کام ہے مگر ایک سچّے شاعر کو خود اعتمادی کی جو قوت ودیعت ہوتی ہے، وہ اس مرحلے کو آسان بنا دیتی ہے۔ مرتضیٰ برلاس نے اس مرحلے سے بار بار گزرنا اپنا معمولِ حیات اور معمولِ فن بنا لیا ہے چنانچہ "تیشۂ کرب" اپنے عصر، اپنے گرد و پیش، اپنے ماحول اور اپنے ہموطنوں کی ذہنیتوں کے بارے میں ان صداقتوں کا ایک مجموعہ ہے جن کا سامنا کرنے سے ہم گریزاں رہتے ہیں کہ خود فریبی نے ہمیں یہی کچھ سکھایا ہے۔ میں نے بڑے بڑے مشاعروں میں مرتضیٰ برلاس کی غزلوں پر بڑے بڑوں کی تیوریاں چڑھتے دیکھی ہیں اور اس پہ ستم برلاس کا اندازِ شعر خوانی، کہ معلوم ہوتا ہے، وہ ذہنوں اور ضمیروں میں الفاظ کے نشتروں سے کچوکوں پر کچوکے دیے جا رہا ہے۔ ایک بار ایک فلم کا

سنسر شو دیکھتے ہوئے ایک بے حد کلچرڈ قسم کے بزرگ نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ منظر کاٹ دینا چاہیے جس میں یہودی ایک مجاہدہ کو اُلٹا لٹکا دیتے ہیں اور اس کے منہ سے خون ٹپک ٹپک کر مصفّا فرش کو گندہ کرنے لگتا ہے۔ میں نے اس منظر کو کاٹ دینے کا سبب پوچھا تو وہ بولے ۔ "یہ منظر دیکھ کر مہذّب لوگوں کا جی اُلٹنے لگے گا"۔

مرتضیٰ برلاس کی غزلیں پڑھ کر روایتی غزل کے مہذّب پرستاروں کو بھی اس طرح کے تجربے سے گزرنے کا خطرہ ہے، مگر جس طرح فلم میں وہ منظر ضروری تھا، اسی طرح فن میں یہ شاعری بھی ضروری ہے کہ جو شاعری بے حسی اور خود آسودگی اور ذات پرستی کی نفی کرتی ہے، وہ ایک مجاہد کا کردار ادا کر رہی ہوتی ہے اور جب اس مجاہد کے ہونٹوں سے خون رس رہا ہو تو دیکھنے سننے والے کا جی نہیں اُلٹنا چاہیے بلکہ ان کے ضمیروں پر جمی ہوئی برف کے خولوں کو چٹخ جانا چاہیے۔

براہِ راست تنقید اس اندازِ شاعری کا لازمہ ہے، مگر سوال یہ ہے کہ کیا صنفِ غزل اس بلا واسطہ تنقید کو برداشت کرنے کی ہیئت رکھتی ہے؟ ممکن ہے اقبال سے پہلے غزل صرف پھولوں کی پتّیوں کی شاعری کہلاتی ہو، مگر اقبال کے بعد تو دنیا کا کوئی موضوع ایسا نہیں ہے، جس نے اُردو غزل میں اپنی جگہ نہ بنالی ہو۔ رہا غزل کا ایمائی انداز تو مرتضیٰ برلاس کا کمال یہی تو ہے کہ وہ بظاہر بالکل سامنے کی بات کہتا ہے اور قطعی براہِ راست انداز میں کہتا ہے۔ مگر جو باتیں وہ اَن کہی چھوڑ جاتا ہے وہی تو اس کی غزل میں ایمائیت کا منصب ادا کر جاتی ہیں۔ برلاس کہتا ہے:

لوگ ہوں مطمئن جب سیہ رات سے، پھیرلیں اپنی آنکھیں جو حالات سے
عقل کے فیصلے جب ہوں جذبات سے، خاک سمجھیں گے ہم مسئلے دستو

ان الفاظ کے عقب میں ہماری سیاست اور معاشرت کا پیچ و تاب کھاتا ہُوا ایک جہان آباد ہے اور یہی وہ ایمائیت ہے جو مرتضیٰ برلاس کی بظاہر بلاواسطہ تنقید میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ یوں سمجھیے کہ اس نئی نوعیت کی ایمائیت سے برلاس نے اُردو غزل کے افق وسیع سے وسیع تر کر دیے ہیں اور وہ اس پائے کے اشعار کہنے پر قادر ہُوا ہے :

پھر جادۂ پرپیچ پہ لغزیدہ خرامی — ٹھوکر جو ابھی کھائی تھی، وہ یاد نہیں کیا؟

کیا بھر گئے وہ زخمِ ہزیمت، جو لگے تھے؟ — ہنسنے کے جواز اب کے بہت غور طلب ہیں

خود رہبرانِ قوم ہیں آلائشوں میں گم — ہم سے مگر مطالبہ قربانیوں کا ہے

مجرم ہو بارسوخ تو قانون کچھ نہیں — کس نے یہ نقش کر دیا میزانِ عدل پر

مرتضیٰ برلاس کی اس نہایت ہی کٹیلی اور نہایت ہی ضروری تنقید کے ہدف بہت سے ہیں۔ وہ سیاست بھی اس کا ہدف ہے جو تجربے سے سبق سیکھنے کی عادی ہی نہیں ہے :

پھر اسی راہ پر ہم نکل آئے ہیں، لٹ گئے تھے جہاں قافلے دوستو

اور پھر وہ رہنما بھی جو کسی بھی مرحلے پر حالات کے تقاضوں کا ساتھ دینے کو تیار نہیں ہیں :

اک نوح نہیں جو ہمیں کشتی میں بٹھا لے
ورنہ کسی طوفان کے آثار تو سب ہیں

برلاس کا ایک اور ہدف اربابِ وطن کی بے حسی ہے:

ہم جو آئینہ دکھائیں تو دکھائیں کس کو
بدنما اپنے ہی چہرے نظر آئیں کس کو

پھر ایک ہدف وہ استحصالی نظام ہے جو معیشت سے لے کر سیاست اور معاشرت اور افراد کی نجی زندگی تک پرواز کرتا ہے۔ یہ نظام ٹوٹ رہا ہے مگر:

اس گزرتے ہوئے موسم کو ہے افسوس تو یہ   چند پودوں میں بھی کیوں ذوقِ نمو باقی ہے
دوپہر بیت گئی پھر بھی جھلستا ہے بدن   اب جو سورج میں تمازت نہیں گو باقی ہے

ظلم و جبر پر فخر کرنے کی ذہنیت بھی برلاس کی تنقید کا ایک ہدف ہے:

ہے زعم کہ شیشہ کوئی محفوظ نہیں ہے
پتھر بھی مرے دور کے اب داد طلب ہیں

آزادی کے بعد بھی آزادی کو کئی پہلوؤں سے پابند کر دینے کا رویہ بھی برلاس کی سچی اور مؤثر تنقید کا نشانہ ہے:

اُڑنے کے لیے کر دیا سمتوں کا تعیّن
زنجیر کٹی، پھر بھی ہم آزاد نہیں کیا؟

اتنی ہمہ گیر اور ہمہ جہت تنقید کرنے والا برلاس اپنی ساری فنّی قوّتیں اور اظہار کی توانائیاں اپنے وطن کے عشق سے حاصل کرتا ہے:

اشک بن کر کہیں جذب ہو جائیں گے، خاک ہو کر کہیں پر بکھر جائیں گے
دشتِ غربت بازی وسعتوں کی قسم، اب تجھے چھوڑ کر ہم کدھر جائیں گے

پاکستان میں علاقائی افتراق کا ایک ہلکا سا سایہ بھی مرتضیٰ برلاس کو انتہائی

حد تک بے چین کر دیتا ہے اور وہ چیخ اُٹھتا ہے:

ہم ایک قبیلے کے سب افراد نہیں کیا؟

پاکستان کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے خواہش مند عناصر کو وہ کبھی للکارتا ہے، کبھی غیرت دلاتا ہے، کبھی تاریخ کے آئینے دکھاتا ہے:

جس شاخ پہ بیٹھے ہوں اسی شاخ کو کاٹیں
ہم لوگ ہی خود اپنی تباہی کا سبب ہیں

رہ جائے اکائی مری قائم، تو غنیمت
ساعت یہ قیامت کی ہے، ٹل جائے تو اچھا

در اصل برلاس اپنے ہموطنوں کو پنجابی یا سندھی یا پٹھان یا بلوچ یا کشمیری یا مہاجر کے گروہوں میں نہیں بانٹتا۔ وہ ان سب کے ساتھ پاکستانیت کے علاوہ ایک اور بہت گہرا رشتہ بھی محسوس کرتا ہے، اور یہ کرب کا رشتہ ہے۔ اس کی پوری شاعری میں کار فرما عناصر کی فہرست تیار کی جائے تو کرب سرِ فہرست جگہ پائے گا۔ اس کے مثبت نقطۂ نظر کے مطابق ہم سب پاکستانی افراد، علاقائی تمیز کے بغیر، سیاست اور معیشت اور معاشرت کے حوالے سے ایک شدید کرب میں مبتلا ہیں اور کرب کی سطح پر ہم سب کا اشتراک ایک ایسی قوت ہے جو نہ صرف علاقائی حد بندیوں کو خاطر میں نہیں لاتی بلکہ کرب کے ان سلاسل کو مشترکہ طاقت سے توڑ دینے پر اُبھارتی ہے۔ برلاس کو اس حقیقت کا کماحقہٗ ادراک حاصل ہے۔ اس کا ایک ثبوت تو اس کی غزلوں کے اس مجموعے کا نام ہے ــــ "تیشۂ کرب"! پھر اس نام میں

تیشے کی شمولیت سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ شاعر اس کرب کو قوت میں بدلنا چاہتا ہے اور اس قوّت سے ان فصیلوں کو توڑ دینا چاہتا ہے جنھوں نے اکثریت کی زندگی کو صدیوں سے کرب ناک بنا رکھا ہے۔ وہ کہتا ہے:

کرب کے رشتے سے سوچے آج کا انساں تو پھر
اجنبی چہروں سے بھی وابستگی محسوس ہو

آنکھیں ہیں سرخ، ہونٹ سیہ، رنگ زرد ہے
ہر شخص جیسے میرے قبیلے کا فرد ہے

کرب ہے قدرِ مشترک، اپنا سا حال ہر طرف!

ظاہر ہے کہ اپنے عصر کے کرب کا اتنا بھرپور شعور رکھنے والا حساس شاعر اپنی نجی زندگی میں بھی بہت سچا اور حوصلہ مند ہوگا، اور جہاں تک مجھے علم ہے، برلاس نے اس شعورِ درد کی چمک میں اپنے لیے جو اصول مرتّب کر رکھے ہیں، وہ اس منافق اور مصنوعی معاشرے کے لیے کسی صورت میں قابلِ قبول نہیں ہیں اور زندگی میں اس نے قدم قدم پر اپنے انہی اصولوں کی مار کھائی ہے مگر اس کے اصول محض برائے بیت نہیں ہیں، اس کی فنّی شخصیّت کی وہ زمین ہے، جن پر وہ کمال پامردی سے قدم جمائے کھڑا ہے:

بُت تو دنیا نے بہرگام تراشے ، لیکن
سر جھکانے کے نہ آئے کبھی آداب مجھے

اس دور میں جینے کے کچھ اور تقاضے تھے
ہم اپنے اصولوں کی تذلیل نہ کر پائے

برلاس کا یہ کرب اجتماعی ہے اور اس کی اصول پرستی ملک گیر ہے، اس لیے ایسا شاعر اس ذات پرستی کا کسی صورت میں موید نہیں ہو سکتا جو حقائق سے فرار کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ ذات پرستی اس کے نزدیک انسانیت کے مستقبل کے لیے ایک قیامت سے کم نہیں ہے:

ذات کے خول میں ہر شخص مقید ہے یہاں
کیا کہیں اس کو، اگر عرصۂ محشر نہ کہیں

وہ ان ذات پرستوں کے سامنے اپنی ذات کی مثال پیش کرتا ہے کہ میں نے شکست کبھی قبول نہیں کی۔ (جبکہ ذات پرستی محض شکست خوردگی ہے)

سانس اُکھڑا کیا، جسم ٹوٹا کیا، ہم نہ ہارے مگر حوصلے دوستو

یہ استقامت اور جرأت برلاس کو پاکستان بلکہ پوری انسانیت کے مستقبل سے مایوس نہیں ہونے دیتی۔ خزاں کے شکنجے میں بھی اس کے کان بہاروں کی آوازِ پا پر لگے رہتے ہیں۔ اور وہ جو اپنے ملک کے استحصالیوں سے طنز اور اعتماد کے ساتھ پوچھتا ہے کہ:

سیلاب کی زد میں تری بنیاد نہیں کیا؟

اور جو انھیں خبردار کرتا ہے کہ:

غروب کے نہیں آثار یہ، تو پھر کیا ہیں
کہ جسم سے بڑے لگتے ہیں اب کے سائے مجھے

اور جو کبھی کبھی اُداس ہو کر یہ بھی کہہ بیٹھتا ہے کہ:

شاعر ہوں میں قبیلۂ مردہ ضمیر کا

اس کا منشورِ فن تو دراصل یہ ہے:

ہم ہیں وہ شاخ کہ جس پر کوئی پتّہ ہے نہ پھل
ہاں مگر شاخِ ثمر بار کی خو باقی ہے

یہ "شاخِ ثمر بار کی خو" برلاس کا نظریۂ فن بھی ہے اور نظریۂ حیات بھی، اور یہ سب دین ہے خلوص اور دیانت پر مبنی اس کرب کی جو اہلِ وطن کے ساتھ شاعر کا رشتہ بھی متعین کرتا ہے اور اس کے لیے قوت اور توانائی اور اس لیے رجا کا سرچشمہ بھی ثابت ہوتا ہے۔

میں اسے قطعی طور پر ایک غیر معمولی بات سمجھتا ہوں کہ جو غزل گو بظاہر صاف اور سیدھے انداز میں، براہِ راست اور کھرا شعر کہتا ہے، غزل میں ایک نئی ایمائیت لے کر آیا ہے۔ ساتھ ہی اس نے شاعری میں علامت کو بھی اتنا آسان اور بلیغ بنا دیا ہے کہ شعروں کو معموں کی طرح حل کرنے والوں کی نظر شاید ہی اس طرح کے مصرعوں پر پڑے کہ:

میری آواز کے کاسے میں لہو باقی ہے

روایتی غزل میں براہِ راست اظہار کو پسند نہیں کیا جاتا، بھلا ہو علامہ اقبالؔ کا کہ انھوں نے اس قدیم مغالطے کی عملاً تغلیط کر دی اور اپنی غزلوں سے آنے والے شاعروں کو یہ گُر سکھایا کہ غزل میں سیدھا شعر کہتے ہُوئے بھی وہ تغزّل برقرار رکھا جا سکتا ہے جو شعر کے مفہوم کو ایک خم سا دیتا ہے..... بالکل کوندے کا سا خم کہ کوندا سیدھا بھی لپکتا ہے تو خمیدہ ہو کر مرتضیٰ برلاسؔ نے براہِ راست اظہار کے باوجود غزل کو تغزل سے آراستہ کرنے کا یہ فن اقبالؔ سے سیکھا ہے اور اس نے اس طرح کے "نشترِ شعر" لکھے ہیں :

لوریاں دی ہیں کسی قرب کی خواہش نے مجھے
کچھ جوانی کے بھی دن گزرے ہیں بچپن کی طرح

کرب کی اک مشترک تحریر ہر چہرے پہ تھی
اجنبی لوگوں سے پل بھر میں شناسائی ہوئی

میں تو کہتا ہوں کہ تم ابرِ کرم ہو، لیکن
کاش صحرا مرے الفاظ کی تائید کرے

احباب میرے اس طرح مجھ پر ہیں طعنہ زن
جیسے خلوص نام ہی نادانیوں کا ہے

روایتی غزل سے مانوس کانوں کو یہ لہجہ سُن کر بڑی حیرت ہوگی، مگر مجھے یقین ہے کہ یہ ایک خوشگوار حیرت ہوگی کیونکہ یہی مستقبل کی غزل کا لہجہ ہے، جس میں شاعری اور اس کا حسن، نیز زندگی اور اس کے حقائق یک جان ہو گئے ہیں۔ اور اس لہجے میں وہ کھنک ہے جو اپنے فکر و فن سے متعلق شاعر کی خود اعتمادی سے پیدا ہوتی ہے۔

۷۔ جنوری ۱۹۷۷ء

احمد ندیم قاسمی

○

عشّاق کو وہ کوہ کنی یاد نہیں کیا
اِس شہر میں اب کوئی بھی فرہاد نہیں کیا

ملبوس جُدا کیوں ہیں، زبانیں ہیں جُدا کیوں
ہم ایک قبیلے کے سب افراد نہیں کیا

ناداں، تُو ہمیں دیکھ کے گرداب میں خوش ہے
سیلاب کی زد پر تری بنیاد نہیں کیا

آنکھیں مری صدیوں سے کرن ڈھونڈ رہی ہیں
اِس ظلمتِ شب کی کوئی میعاد نہیں کیا

اُڑنے کے لیے کر دیا سمتوں کا تعیّن
زنجیر کٹی، پھر بھی ہم آزاد نہیں کیا

پھر جادۂ پُرپیچ پہ لغزیدہ خرامی
ٹھوکر جو ابھی کھائی تھی، وہ یاد نہیں کیا

○

یہ مرحلے بھی محبّت کے باب میں آئے
خلوص چاہا تو پتھّر جواب میں آئے

خوشا وہ شوق کہ در در لیے پھرا مجھ کو
زہے نصیب کہ تم انتخاب میں آئے

ہزار ضبط کروں، لاکھ دِل کو بہلاؤں
مگر وہ شکل جو ہر روز خواب میں آئے

میں کیا کہوں کہ ترا ذکر غیر سے سُن کر
جو وسوسے دلِ خانہ خراب میں آئے

وہیں قبیلۂ مُردہ ضمیر لکھ دینا
ہمارا ذکر جہاں بھی کتاب میں آئے

ریا کے دَور میں سچ بول تو رہے ہو مگر
یہ وصف ہی نہ کہیں احتساب میں آئے

میں اپنے دیس کی مٹی سے پیار کرتا ہوں
یہ جرم بھی مری فردِ حساب میں آئے

○

بے حس و کج فہم و لاپروا کہے
کل مؤرخ جانے ہم کو کیا کہے

اس طرح رہتے ہیں اس گھر کے مکیں
جس طرح بہرہ سُنے، گونگا کہے

راز ہائے ضبطِ غم کیا چھپ سکیں
ہونٹ جب خاموش ہوں، چہرہ کہے

اس لیے ہر شخص کو دیکھا کیے
کاش کوئی تو مجھے اپنا کہے

ہے تکلّم آئینہ احساس کا
جس کی جیسی سوچ ہو ویسا کہے

پڑھ چکے دریا قصیدہ ابر کا
کیا زبانِ خشک سے صحرا کہے

بدگمانی صرف میری ذات سے
میں تو وہ کہتا ہوں جو دنیا کہے

○

سازِ خاموش ہُوئے، سوزِ گلو باقی ہے
میری آواز کے کاسے میں لہو باقی ہے

اس گزرتے ہُوئے موسم کو ہے افسوس تو یہ
چند پودوں میں بھی کیوں ذوقِ نمو باقی ہے

دوپہر بیت گئی، پھر بھی جھلستا ہے بدن
گرچہ سورج میں تمازت نہیں، لُو باقی ہے

آب و گل میں وہ جراثیم خرد نے گھولے
رنگ باقی نہ کسی پھول میں بُو باقی ہے

ہم ہیں وہ شاخ کہ جس پر کوئی پتہ ہے نہ پھل
ہاں مگر شاخِ ثمر بار کی خو باقی ہے

—

میں نے دنیا کے دکھ بانٹے میرا درد بٹائے کون
جس کی کڑیاں ٹوٹ رہی ہوں اس چھت نیچے آئے کون

○

ہم جو آئینہ دکھائیں، تو دکھائیں کس کو
بدنما اپنے ہی چہرے نظر آئیں کس کو

کس کو فرصت ہے کہ رودادِ غمِ غیر سنے
روز و شب کیسے گزرتے ہیں، بتائیں کس کو

سایہ قدموں کے تلے، دیکھ کے مسرور ہیں لوگ
سر پہ سورج ہے، یہ احساس دلائیں کس کو

وقت شبخوں کے لیے لیس ہے ہتھیاروں سے
شہر کا شہر ہی سویا ہے، جگائیں کس کو

ہر کوئی محوِ تماشائے لبِ بام ہے اب
وہ جو قدموں میں پڑے ہیں، نظر آئیں کس کو

خون ہاتھوں میں لگا ہے سبھی غمخواروں کے
زخم کس کس نے لگائے ہیں، بتائیں کس کو

گونج ہوتی ہے، بگولا سا نظر آتا ہے
ڈھونڈتی ہیں مرے صحرا میں ہوائیں کس کو

○

دریچوں سے کرن پھوٹی، نہ روزن سے پیام آیا
اندھیرا چھا گیا ہر سُو، تو وہ بالائے بام آیا

مجھے مغلوب کرنے کو مرے دشمن کی جانب سے
کبھی نفرت کے تیر آئے، کبھی چاہت کا دام آیا

مگر، اب تشنہ لب منّت کشِ ساقی نہیں ہوں گے
کہ بڑھ کر چھین لیں گے اب اگر اُن تک نہ جام آیا

سجا کر سر پہ سورج کو جسے پیروں میں روندا ہے
وہ سایہ جسم سے بڑھ جائے گا جب وقتِ شام آیا

یہ موضوعِ سخن تھا آج کل سقراط کتنے ہیں
خدا کا شکر ہے میرا بھی کچھ لوگوں میں نام آیا

یہ شب گزرے تو ہم کو اپنی منزل مل بھی سکتی ہے
مسافر لُٹ بھی سکتے ہیں یہ وہ نازک مقام آیا

مری غربت نمو کے قرض سے بے چین رہتی تھی
میں جس مٹی کا پروردہ تھا اس مٹی کے کام آیا

○

اشک بن کر یہیں جذب ہو جائیں گے، خاک ہو کر یہیں ہم بکھر جائیں گے
دشتِ غربت! تری وسعتوں کی قسم، اب تجھے چھوڑ کر ہم کدھر جائیں گے

تم تو ہم سے ملے تھے بہت سرسری، یہ نہ سوچا تھا تم نے مگر، اجنبی
ہم تو دھڑکن ہیں، دل میں سما جائیں گے، ہم ہیں نشّہ، بدن میں اُتر جائیں گے

کل کی نسلیں نہ ہم پر تأسف کریں، بے حسی پر نہ اِس دور کی تُف کریں
دوستو! ہم تو اوراقِ تاریخ میں ورثۂ اشکِ غم چھوڑ کر جائیں گے

اپنی محرومیوں کا نہیں کوئی غم، داغِ حسرت بنائیں گے خورشید ہم
تیری تصویر میں، صبحِ ارضِ وطن! ہم تو ایثار کا رنگ بھر جائیں گے

دشمنانِ محبّت میں شامل ہیں وہ، جن کو اپنا سمجھتے تھے قاتل ہیں وہ
کوئی دھڑکا نہیں، کوئے قاتل میں ہم سر بکف جائیں گے بے سپر جائیں گے

باقی ابھی کچھ اور بھی رسوائی رہ گئی
اب دیکھنے کو کیا مری بینائی رہ گئی
شاعر ہوں میں قبیلۂ مردہ ضمیر کا
کس کام کی یہ جرأتِ گویائی رہ گئی

○

چہرے پہ میرے رنگ پریشانیوں کا ہے
دریا میں سارا زور ہی طغیانیوں کا ہے

خود رہبرانِ قوم ہیں آلائشوں میں گم
ہم سے مگر مطالبہ قربانیوں کا ہے

احباب میرے اس طرح مجھ پر ہیں طعنہ زن
جیسے خلوص نام ہی نادانیوں کا ہے

ساحل جو کٹ کے گرتے ہیں دریا کی گود میں
کیا یہ قصور بہتے ہُوئے پانیوں کا ہے

انساں نہیں ہے کوئی بھی سائے ضرور ہیں
منظر ہر ایک شہر میں ویرانیوں کا ہے

کچھ خوفِ احتساب نہ سود و زیاں کا ڈر
یہ فائدہ تو بے سر و سامانیوں کا ہے

—

○

ماضی کو بُرا کہتے ہیں ہم لوگ عجب ہیں
ماضی میں یہ حالات کہاں تھے کہ جو اَب ہیں

ہے زعم کہ شیشہ کوئی محفوظ نہیں ہے
پتھر بھی مرے دَور کے اب دادطلب ہیں

اب نوح کہاں جو ہمیں کشتی پہ بٹھا لے
ورنہ کسی طوفان کے آثار تو سب ہیں

اب میں ہی سہی، کوئی تو شب جاگ کے کاٹے
جو جاگنے والے تھے، وہ سب غرقِ طرب ہیں

تارے جو نمایندۂ خورشید تھے شب کو
اب صبح کی زد پر وہی واماندۂ شب ہیں

کیا بھر گئے وہ زخمِ ہزیمت، جو لگے تھے؟
ہنسنے کے جواز اب کے بہت غور طلب ہیں

جس شاخ پہ بیٹھے ہوں، اسی شاخ کو کاٹیں
ہم لوگ ہی خود اپنی تباہی کا سبب ہیں

○

ضبط کرتے رہیں حالِ دلِ مضطر نہ کہیں
یہ بھی ہے پاسِ وفا، تجکو ستمگر نہ کہیں

میرے احباب کا اس دور میں معیار ہے یہ
بیٹھ پیچھے جو کہیں، وہ مرے منھ پر نہ کہیں

ہم جو کہتے ہیں نشّے میں ہمیں کہہ لینے دو
عین ممکن ہے کہ پھر ہوش میں آکر نہ کہیں

گونج اپنی سہی، تائید میں آواز تو ہے
کیوں ترے شہر سے ہم دشت کو بہتر نہ کہیں

بات اتنی ہے کہ ہم اذنِ تکلم چاہیں
آپ کے حلقہ نشیں بات بڑھا کر نہ کہیں

ذات کے خول میں ہر شخص مقیّد ہے یہاں
کیا کہیں اس کو اگر عرصۂ محشر نہ کہیں

گرد اتنی ہے کہ پہچان نہ پائیں خود کو
جبر ہے، پھر بھی فضاؤں کو مکدّر نہ کہیں

یوں تو اظہارِ غمِ دل کی اجازت ہے ہمیں
شرط یہ بھی ہے کہ پتھّر کو بھی پتّھر نہ کہیں

ہم ہیں فنکار مفکر کے مؤرخ تو نہیں
ہم کو ہوتا ہے جو محسوس وہ کیونکر نہ کہیں

سرخی سی نظر آتی ہے آکاش پہ یارو
اب رات کے ڈھلنے کے کچھ آثار ہوئے ہیں

قطعہ

ہزار بار یہ طوفاں ہمیں سے کھیلے ہیں
یہ اور بات کہ ساحل کا جھاگ ہیں ہم لوگ
ہمیں خموش ہی رہنے دے مطربِ ناداں
جو تار توڑ کے نکلے وہ راگ ہیں ہم لوگ

○

وقت کی تیز تپتی ہوئی ریت پر پڑ گئے پاؤں میں آبلے دوستو
سانس اکھڑا گیا، جسم ٹوٹا گیا، ہم نہ ہارے مگر حوصلے دوستو

رنگ و بو کی کشش ہے ہوس ہی ہوس، اپنا دستِ رسا دیکھنا چاہیے
ہاتھ جلتے ہوں جب پھول کی آنچ سے، ایسے پھولوں سے کانٹے بھلے دوستو

میری ناکامیوں کی دبی آگ سے، جانے کس کس کے دامن جھلس جائیں گے
بات چھیڑی تو پھر بات بڑھ جائے گی، یہ بھی سوچا کبھی منچلے دوستو

شوقِ صحرا نوردی تو دیکھو ذرا، جس کو دیدارِ منزل گوارا نہیں
جتنی تیزی سے ہم سوئے منزل بڑھے اور بڑھتے گئے فاصلے دوستو

لوگ ہوں مطمئن جب سیہ رات سے، پھیر لیں اپنی آنکھیں جو حالات سے
عقل کے فیصلے جب ہوں جذبات سے، خاک سمجھیں گے ہم مسئلے دوستو

خود ہی اپنا تحفظ کریں ہمسفر، سب مسافر رہیں جاگتے رات بھر
پھر اسی راہ پر ہم نکل آئے ہیں، لُٹ گئے تھے جہاں قافلے دوستو

○

اک برگِ سبز شاخ سے کر کے جُدا بھی دیکھ
میں پھر بھی جی رہا ہوں، مرا حوصلہ بھی دیکھ

مانا کہ تیرا مجھ سے کوئی واسطہ نہیں
ملنے کے بعد مجھ سے، ذرا آئینہ بھی دیکھ

ذرّے کی شکل میں مجھے سمٹا ہُوا نہ جان
صحرا کے روپ میں مجھے پھیلا ہُوا بھی دیکھ

تُو نے تو مشتِ خاک سمجھ کے اُڑا دیا
اب مجھ کو اپنی راہ میں بکھرا ہُوا بھی دیکھ

خوابوں کے سلسلے تو گھروندے ہیں ریت کے
بیدار ہو کے جسم کا یہ فاصلہ بھی دیکھ

تیرے لیے تو صرف اشاروں کا کھیل تھا
مجھ کو جو پیش آیا ہے، وہ حادثہ بھی دیکھ

اوروں کے پاس جا کے مری داستاں نہ پوچھ
جو کچھ ہے میرے چہرے پہ لکھا ہُوا بھی دیکھ

ہموار راستوں پہ مرا ساتھ چھوڑ کر
آگے نکل گیا ہے تو اب راستہ بھی دیکھ

چہرے کی چاندنی پہ نہ اتنا بھی مان کر
وقتِ سحر تُو رنگ کبھی چاند کا بھی دیکھ

—

کوئی ٹھوکر جو لگی گردشِ دوراں کے سبب
لوگ اس کو بھی مری لغزشِ پا کہتے ہیں

قطعہ

لبوں پہ پھیکی سی مسکراہٹ، دلوں میں خوف و ہراس پایا
عجیب یہ دورِ آگہی ہے کہ جس کو دیکھا اُداس پایا
یہ چیتھڑے کم سے کم ہماری برہنگی تو چھپا رہے ہیں
وگرنہ زرّیں لباس میں تو ہر اک کو ننگِ لباس پایا

○

کلیوں کو شاخ شاخ سے چننے میں عار کس کو ہے
کہنے کو گل پرست ہیں، دردِ بہار کس کو ہے

غیروں کی رنجشوں کے تیر، اپنوں کی سازشوں کے وار
زخموں کا کیا حساب دوں، تابِ شمار کس کو ہے

محبسِ روزگار میں جان بچے تو شکر کر
حرص زدوں کی بھیڑ میں جائے فرار کس کو ہے

مجھ سے زیادہ کون ہے دار و رسن کا مستحق
میری طرح سے دوستو! خوابوں سے پیار کس کو ہے

ویسے تو ہر کوئی یہاں سچ کی تلاش میں ہے گم
کس کو طلب ہے زہر کی، خواہشِ دار کس کو ہے

—

ضبط کا حوصلہ دنیا کو بھی بخشا ہوتا
تو نے بخشی تھی اگر جرأتِ اظہار مجھے

○

جس کو دیکھو زرد چہرہ آنکھ پتھرائی ہوئی
خوب، اے عیسیٰ نفس! تیری مسیحائی ہوئی

کرب کی اک مشترک تحریر ہر چہرے پہ تھی
اجنبی لوگوں سے پل بھر میں شناسائی ہوئی

بے اصولی مصلحت کے نام سے پھولی پھلی
ہم اصولوں پر لگے چلنے تو رسوائی ہوئی

کر رہا ہوں حال میں گزرے ہُوئے لمحے تلاش
گتھیاں سلجھا رہا ہوں اپنی الجھائی ہُوئی

سر سے اُونچا تھا جو پانی، سر سے اُونچا ہی رہا
جتنا قد بڑھتا گیا اتنی ہی گہرائی ہوئی

کوئی باعزم جب سوئے منزل بڑھا راہ میں حسرتِ بدنصیب آ گئی
دستِ سقراط میں جامِ سم آ گیا، ابنِ مریم کے آگے صلیب آ گئی

○

آنکھیں اُداس چار سُو، چہرے نڈھال ہر طرف
شرق ہو چاہے غرب ہو جینا وبال ہر طرف

عقل کی موشگافیاں اب ہیں کمال کے قریب
عشق کی وضعداریاں رُو بہ زوال ہر طرف

جرم خلوص کے سوا کوئی نہیں تو کیوں سزا؟
چھوڑا مرے وجود نے نقشِ سوال ہر طرف

جھوٹ بہ عذرِ مصلحت، جبر بہ مصلحت روا
جائیں کہاں کہ دُور تک پھیلا ہے جال ہر طرف

شہر ترا نیا سہی، لوگ تو اجنبی نہیں
کرب ہے قدرِ مشترک ایک سا حال ہر طرف

—

دریا کو بھر گئے ہیں بادل برس برس کے
صحرا میں مر گئے ہم اک بوند کو ترس کے

○

اپنا تو بس کام یہی ہے سب کے غم اپناتے رہنا
اپنے ناخن زخمی کرنا اور گتھّی سُلجھاتے رہنا

لوگ جو تم کو بادل سمجھیں، بارش کی اُمید کریں گے
اور تمھارا کام ہمیشہ پتھّر ہی برساتے رہنا

ہم ہیں وہ آواز جو گُھٹ کے ساری فضا میں گونج رہے ہیں
بعد ہمارے آوازوں کو زنجیریں پہناتے رہنا

آج یہ جن دیواروں کے تم روزن بند کیے جاتے ہو
کل کو ان دیواروں سے پھر اپنا سر ٹکراتے رہنا

ہم تو چراغِ اوّلِ شب ہیں، اوّلِ شب بجھ جائیں گے ہم
تم ہی یارو! آخرِ شب تک دیپ سے دیپ جلاتے رہنا

اے طائرِ اسیر یہی بال و پر تھے کیا
دو دن کی قید طاقتِ پرواز لے گئی

○

باہر سے لیپ پوت کے چمکا لیا ہے گھر
اندر شکستہ کڑیاں ہیں، ٹوٹے ہوئے ہیں در

یہ دورِ آگہی ہے عجب دورِ آگہی،
معتوب علم و فن ہے تو مصلوب ہے ہُنر

یوں تو وطن بھی جان سے بڑھ کر عزیز ہے
اپنا مفاد سب کو ہے لیکن عزیز تر

دانشوروں نے ہاتھ میں کشکول لے لیے
اکثر لرز اٹھا ہوں میں انجام سوچ کر

"مجرم ہو با رسوخ تو قانون کچھ نہیں"
کس نے یہ نقش کر دیا میزانِ عدل پر

جیسے کہ شعر و شور میں کچھ فرق ہی نہیں
ہم کیسے باشعور ہیں، ہم کیسے نغمہ گر

آگ اور خوں کی لمبی مسافت کے باوجود
ہم پھر سے آ گئے ہیں اِسی پہلے موڑ پر

○

آنکھیں ہیں سرخ، ہونٹ سیہ، رنگ زرد ہے
ہر شخص جیسے میرے قبیلے کا فرد ہے

جب میں نہ تھا تو میری زمانے میں گونج تھی
اب میں ہوں اور سارے زمانے کا درد ہے

سورج میں آج جتنی تپش ہے، کبھی نہ تھی
کیا کیجیے کہ خوں ہی رگ و پے میں سرد ہے

ہم کس سفر پہ نکلے کہ شکلیں بدل گئیں
چہرے پہ جس کے دیکھو مسافت کی گرد ہے

چلتا رہے جو آبلہ پائی کے باوجود
منزل کا مستحق وہی صحرا نورد ہے

ایسا نہ ہو سحر میری بینائی چھین لے
بیداریوں سے اب مری آنکھوں میں درد ہے

بکھرا ہُوا ہوں خواہش و حسرت کے درمیاں
جیسے مرا وجود ابھی فرد فرد ہے

○

چہرے پہ کیوں ہیں کرب کے آثار کچھ نہ پوچھ
اب ہیں نے سی لیے لبِ اظہار کچھ نہ پوچھ

پانی پہ ایک عکس ابھرنا تو یاد ہے
ہاتھوں سے گر گئی کہاں پتوار کچھ نہ پوچھ

بس یہ سمجھ کہ سانس ہی سادھے ہوئے ہیں لوگ
کیسے کھڑی ہے ریت کی دیوار کچھ نہ پوچھ

سورج کو کیا خبر کہ طلوعِ سحر کے ساتھ
کتنے گرے ہیں نور کے مینار کچھ نہ پوچھ

اس کارواں نے کتنے ہی رہرو کچل دیے
ہے دورِ آگہی کی جو رفتار کچھ نہ پُوچھ

اب کے جو سو گئے تری لوری کی تان پر
کب تک ہوں پھر وہ خواب سے بیدار کچھ نہ پوچھ

یہ دیکھ، رنگ میرے لہو کا کہاں گیا
کیونکر دیے ہیں وقت کو شہکار کچھ نہ پوچھ

—

○

جیتے جی میرے ہر اک مجھ پہ ہی تنقید کرے
اور مر جاؤں تو دنیا مری تقلید کرے

میں تو کہتا ہوں کہ تم ابرِ کرم ہو لیکن
کاش صحرا مرے الفاظ کی تائید کرے

جب ہر اک بات یہاں تشنۂ تکمیل رہے
پھر کرے کوئی تو کیا جرأتِ تمہید کرے

میں سمجھتا ہوں کہ مجھ سا کوئی مغموم نہیں
حال ہر شخص کا لیکن مری تردید کرے

پہلے ہر شخص گریبان میں اپنے جھانکے
پھر بصد شوق کسی اور پہ تنقید کرے

میں ہی اب زہر پیے لیتا ہوں سچ کی خاطر
کوئی تو سنّتِ سقراط کی تجدید کرے

وہ مری جراَتِ پرواز کو کیا سمجھے گا
جو فضاؤں کو محیطِ مہ و خورشید کرے

○

صدا یہ کس کی ہے جو دُور سے بُلائے مجھے
قریب جاؤں تو کچھ بھی نظر نہ آئے مجھے

میں بجھتے بجھتے دھوئیں کی لکیر چھوڑوں گا
یہ بادِ تند ذرا سوچ کر بجھائے مجھے

جلا ہو دھوپ میں اور خال و خد نہ بگڑے ہوں
بھرے جہاں میں وہ اک شخص تو دکھائے مجھے

یہ کس نگر میں مجھے تو نے لا کے چھوڑ دیا
یہاں تو اپنے بھی لگتے ہیں سب پرائے مجھے

کسی کے لمس سے کندن میں ہو تو سکتا ہوں
مگر یہ شرط، کوئی چھو کے آزمائے مجھے

غروب کے نہیں آثار یہ، تو پھر کیا ہیں
کہ جسم سے بڑے لگنے ہیں اب تو سائے مجھے

○

چہرے نہیں تو سائے ہی دکھلائی دے گئے
برسوں کے رتجگے ہمیں بینائی دے گئے

سورج بھی میری عمر کا کچھ سر پہ آگیا
کچھ تجربے بھی سوچ کو گہرائی دے گئے

اشکوں کے دیپ، عزم کی خوشبو، وفا کے رنگ
منظر کو کتنا حسن تماشائی دے گئے

تازہ ہے آج تک وہ تکلّم کی نغمگی،
یہ کیا کیا کہ گونجتی تنہائی دے گئے

تھے آپ کے ستم ہی جو دورِ سکوت میں
ان پتھّروں کو قوّتِ گویائی دے گئے

وہ اور تھے جو بیٹھ گئے تھک کے راہ میں
یہ حادثے ہمیں تو توانائی دے گئے

⊙

ہر تیر جو ترکش میں ہے چل جائے تو اچھا
حسرت مرے دشمن کی نکل جائے تو اچھا

رہ جائے اکائی مری قائم تو غنیمت
ساعت یہ قیامت کی ہے ٹل جائے تو اچھا

خیرہ ہوئی جاتی ہیں نگاہیں، وہ چمک ہے
سورج نئی تہذیب کا ڈھل جائے تو اچھا

ٹھوکر کہیں لگ جائے نہ اس تیز روی میں
اب وقت کی رفتار بدل جائے تو اچھا

یہ سانس کی ڈوری بھی جو کٹ جائے تو بہتر
اک پھانس ہے سینے سے نکل جائے تو اچھا

فردا کے حسیں خواب دکھائے کہ مرا دل
خوش رنگ کھلونوں سے بہل جائے تو اچھا

ڈالے گئے اِس واسطے پتھّر مرے آگے
ٹھوکر سے اگر ہوش سنبھل جائے تو اچھا

—

○

ہمصفیروں سے جو بھٹکائے وہ اعزاز نہ دے
تو مجھے شوق سے اب قوّتِ پرواز نہ دے

دائرے ٹوٹ نہ جائیں مرے خوابوں کے کہیں
جب میں سو جاؤں مجھے کوئی بھی آواز نہ دے

تجھ کو دینا ہے اگر تلخیٔ انجام کا زہر
دینے والے مجھے خوش فہمیٔ آغاز نہ دے

رازداروں کا کہا مان کے یہ حال ہُوا
مشورہ کوئی مجھے اب مرا ہمراز نہ دے

یا فضاؤں کو محیطِ مہ و خورشید نہ کر
یا مری فکر کو تُو جراُتِ پرواز نہ دے

یا زمانے کو تُو محرومِ سماعت کر دے
یا مجھے درد میں ڈوبی ہُوئی آواز نہ دے

—

○

تم اک ایسے شخص کو پہچانتے ہو یا نہیں
جس کا چہرہ بولتا ہے اور لب گویا نہیں

صبح کو چہرے پہ تھے دو زخم آنکھوں کی جگہ
رات کچھ رونے کی خواہش تھی مگر رویا نہیں

پھیلتا جاتا ہے خود رَو سبزۂ غم چار سُو
کھیت وہ کاٹوں گا جو میں نے کبھی بویا نہیں

وہ بچھڑ کے اور بھی شدّت سے یاد آنے لگا
میں نے جس کو کھو دیا، دل نے اسے کھویا نہیں

خواب دیکھا تھا کوئی بچپن کی کچّی نیند میں
دوستو! پھر چین سے میں آج تک سویا نہیں

زینتِ ملبوسِ ہستی بڑھ گئی جس داغ سے
زندگی بھر میں نے پھر اس داغ کو دھویا نہیں

○

مٹی تھا سیلِ نور میں تبدیل ہو گیا
اُڑتے ہی میں فضاؤں میں تحلیل ہو گیا

جب میرا نام ریت پہ لکھنے چلی ہوا
اک نقش ناتمام سا تشکیل ہو گیا

ہالہ ہے روشنی کا کہ چلتا ہے ساتھ ساتھ
اک چاند جب سے مرکزِ تخئیل ہو گیا

جتنا قریب لایا گیا میں صلیب کے
جو کچھ کہا زباں سے وہ انجیل ہو گیا

یا زندگی یہی تھی جو میں نے گزار دی
یا حکمِ بندگی تھا کہ تعمیل ہو گیا

یارو مجھے بدمست نہ سمجھو کہ میں اکثر
جو بات پتے کی ہو وہ کہتا ہوں نشے میں

○

جنوں کا ذکر سرِ عام ہو گیا تو کیا
میں تیرے شہر میں بدنام ہو گیا تو کیا

جہاں نے کس کو سزاوارِ آگہی جانا
جو میں بھی موردِ الزام ہو گیا تو کیا

کوئی صلیب پہ لٹکا کسی نے زہر پیا
مرا بھی گر یہی انجام ہو گیا تو کیا

کوئی اصول مرا مطمحِ نظر تو رہا
شہیدِ حسرتِ ناکام ہو گیا تو کیا

ہزار شمعیں جلا کر ضیاء بکھیر گیا
خموش میں جو سرِ شام ہو گیا تو کیا

حریفِ گردشِ ایّام تو رہا برسوں
میں آج کشتۂ آلام ہو گیا تو کیا

○

فطرت تھی ستم پرور تبدیل نہ کر پائے
وعدے تو کیے لیکن تکمیل نہ کر پائے

سورج کی تو خواہش تھی ہم اس کی کرن ہوتے
ہم خود کو فضاؤں میں تحلیل نہ کر پائے

اِس دَور میں جینے کے کچھ اور تقاضے تھے
ہم اپنے اصولوں کی تذلیل نہ کر پائے

ہاں دیدہ خداؤں کو سجدے نہ کیے ورنہ
کیا حکم تھا ہم جس کی تعمیل نہ کر پائے

حیراں ہوں کہ ان کو بھی ہے نازِ براہیمی
شعلوں کو جو پھولوں میں تبدیل نہ کر پائے

تم ایسے مصوّر کے آدرش کو کیا سمجھو
نقطے کے سوا جو کچھ تشکیل نہ کر پائے

حالاتِ دگرگوں کا اس نے تو سبب پوچھا
ہم خود ہی بیانِ غم کی تفصیل نہ کر پائے

○

ہم کہ تجدیدِ عہدِ وفا کر چلے، آبروئے جنوں کچھ سوا کر چلے
خود تو جیسے کٹی زندگی کاٹ لی، ہاں نئے دور کی ابتدا کر چلے

زرد سورج کی مشعل بھی کجلا گئی، چاند تاروں کو بھی نیند سی آ گئی
اب کسی کو اگر روشنی چاہیے، اپنی پلکوں پہ شمعیں جلا کر چلے

حال اپنا ہر اک سے چھپاتے رہے، زخم کھاتے رہے، مسکراتے رہے
تیری تشہیر ہم نے گوارا نہ کی، دردِ دل ہم ترا حق ادا کر چلے

لاکھ الزام پر مجھ کو الزام دو، میری تر دامنی کے فسانے کہو
تم میں اے کاش کوئی تو ایسا بھی ہو، دو قدم ہی سہی سر اُٹھا کر چلے

چوٹ جو بھی پڑی ٹھیک دل پر پڑی اس پہ بھی ہم نے ترکِ طلب تو نہ کی
ہم تو مٹ کے بھی اے گردشِ آسماں تیرے شانے سے شانہ ملا کر چلے

—

○

چلتے چلتے چور بدن ہے، پیروں میں لاکھوں چھالے ہیں
ہم کو دیکھو کتنی تھکن ہے، پھر بھی ہوش سنبھالے ہیں

قسمت کی پیچیدہ گتھّی، باتوں سے کب سلجھی ہے
ناخن زخمی ہو گئے میرے، تب کچھ پیچ نکالے ہیں

جس سے بھیک طلب کی، اُس نے کاسۂ دل ہی توڑ دیا
چاند سی صورت رکھنے والے، دل کے کتنے کالے ہیں

صرف سحر کی آس میں جب تم آخرِ شب تک جاگے ہو
سو مت جانا جاگنے والو اس کے بعد اُجالے ہیں

جب تک ہم خاموش رہے تو دنیا ہم پر واری تھی
دل کی بات کہی تو سب نے کتنے عیب نکالے ہیں

○

دنیا کو دیکھیے ذرا آنکھیں تو کھولیے
سورج چڑھا ہے سر پہ بڑی دیر سو لیے

ساری مسرتیں تری خوشیوں پہ وار دیں
جتنے بھی غم ملے ترے غم میں سمو لیے

ہم کو نجانے کیا ہُوا پھولوں کو دیکھ کر
ہاتھوں میں ہم نے جان کے کانٹے چبھو لیے

مجبوریاں کہیں کہ اسے سادگی کہیں
جس نے بھی ہنس کے بات کی ہم ساتھ ہو لیے

روئے خطاب ہے کسی نازک مزاج سے
چہرے پہ حال لکھے نگاہوں سے بو لیے

سیپیں کھلی رہیں گی جو موتی نکل گئے
آنکھوں کی سیپیوں سے جواہر نہ رو لیے

تازہ رکھا ہے ذہن میں کربِ شکستگی
جب کچھ نہ بن پڑا تو کہیں چھپ کے رو لیے

—

○

یوں تو ساحل سے نظر آیا تھا سیلاب مجھے
پاؤں ڈالا تو یہ دریا ملا پایاب مجھے

شدّتِ کرب سے کمھلا گئے چہرے کے خطوط
اب نہ پہچان سکیں گے مرے احباب مجھے

بُت تو دُنیا نے بہر گام تراشے لیکن
سر جھکانے کے نہ آئے کبھی آداب مجھے

وسعتیں دامنِ صحرا کو بھی بخشی ہوتیں
تو نے بخشی تھی اگر فطرتِ سیماب مجھے

ایک سایہ کہ مجھے چین سے سونے بھی نہ دے
ایک آواز کہ کرتی رہے بیتاب مجھے

جب چٹانیں ہی بہی جاتی ہیں تنکوں کی طرح
جانے لے جائے کہاں وقت کا سیلاب مجھے

جس کی خواہش ہیں کسی بات کی خواہش نہ رہے
ایسی جنّت کے دکھائے نہ کوئی خواب مجھے

—

⊙

اک یاد تھی کسی کی جو بادل بنی رہی
صحرا نصیب کے لیے چھاؤں گھنی رہی

وہ نقش ہوں جو بن کے بھی اب تک نہ بن سکا
وہ بات ہوں جو کہہ کے بھی ناگفتنی رہی

پتھر کا بُت، سمجھ کے یہ کس شے کو چھُو لیا
برسوں تمام جسم میں اک سنسنی رہی

اس جانِ گل کو دیکھتے کیسے کہ آج تک
اک رنگ و بو کی سامنے چادر تنی رہی

وہ دھند تھی کہ کچھ بھی دکھائی نہ دے سکا
وہ حبس تھا کہ کیفیّتِ جانکنی رہی

—

○

جذبہ اخلاص کی ہر جا کمی محسوس ہو
اب تو ہمسایہ بھی جیسے اجنبی محسوس ہو

جس کو دیکھو آپ میں گم دوسروں سے بے نیاز
انجمن میں آ کے بھی اک خامشی محسوس ہو

اس لیے شمعیں جلائی ہیں سرِ نوکِ مژہ
آنے والوں کو بھی کچھ تو روشنی محسوس ہو

کل کوئی آزر ملے ایسا کہ جس کے لمس سے
کیا عجب ان پتھّروں میں زندگی محسوس ہو

کرب کے رشتے سے سوچے آج کا انساں تو پھر
اجنبی چہروں سے بھی وابستگی محسوس ہو

پیش گوئی ہم نے جو اشعار میں کی تھی کبھی
اب تو ہر جانب اسی کی گونج سی محسوس ہو

زندگی بھر کرب کی سُولی پہ ہم لٹکے رہیں
دیکھنے والوں کو لیکن دل لگی محسوس ہو

—

○

ملتے ہی خود کو آپ سے وابستہ کہہ دیا
محسوس جو کیا وہی برجستہ کہہ دیا

میں چپ ہُوا تو زخم مرے بولنے لگے
سب کچھ زبانِ حال سے لب بستہ کہہ دیا

خورشیدِ صبحِ نو کو شکایت ہے دوستو
کیوں شب سے ہم نے صبح کو پیوستہ کہہ دیا

چلتا رہا تو دشت نوردی کا طنز تھا
ٹھہرا ذرا تو آپ نے پابستہ کہہ دیا

دیکھا تو ایک آگ کا دریا تھا موجزن
اس دورِ نا سزا نے جسے رستہ کہہ دیا

"مجرم تھے وہ جو کر نہ سکے ازتکابِ جرم"
ملزم ہیں ہم جو راز تھا سربستہ کہہ دیا

دیکھی گئی نہ آپ کی آزردہ خاطری
کانٹے ملے تو ان کو بھی گلدستہ کہہ دیا

○

دوستوں کے حلقے میں ہم وہ کج مقدر ہیں
افسروں میں شاعر ہیں، شاعروں میں افسر ہیں

آندھیاں لپکنے سے، بجلیاں چمکنے سے
کاش تم سمجھ سکتے جو رُتوں کے تیور ہیں

موسموں کی سازش سے کس کو باخبر کیجے
اب ہمارے شہروں میں سارے لوگ پتّھر ہیں

جرأتِ بیاں میری، مجھ سے چھین لے یارب
جن سے میں مخاطب ہوں، بے حسی کے پیکر ہیں

بات یہ الگ شاید بخت ہو سکندر کا
ورنہ ساتھ پورس کے ہاتھیوں کے لشکر ہیں

دشمنوں سے یہ کہہ دو زحمتِ عداوت کیوں
ہم ہیں میر صادق ہیں، ہم ہیں میر جعفر ہیں

جو قصیدہ لکھتے ہیں روز چڑھتے سورج کا
حیف، وہ بزعمِ خود آج کے سخنور ہیں

—

○

گر فلسفی و شاعر و فنکار نہ ہوتے
جو اَب ہیں صداقت کے وہ معیار نہ ہوتے

کیسے کوئی پہچانتا پھر خیر کو شر سے
دنیا میں اگر ہم سے گنہ گار نہ ہوتے

آواز میں غم گھول دیا تھا تو کم از کم
چہرے پہ مرے کرب کے آثار نہ ہوتے

اِس دھوپ میں سائے کی طلب کس کو نہیں تھی
اے کاش کہ تم ریت کی دیوار نہ ہوتے

احباب جو ساحل پہ مجھے مل ہی گئے تھے
منجدھار میں چھٹی ہُوئی پتوار نہ ہوتے

—

یارو مجھے کیوں ڈبتے ہو فردا کے دلاسے
اک دیپ کی لَو کیسے لڑے تند ہوا سے

○

کس کس کا منھ بند کروگے کس کس کو سمجھاؤ گے
دل کی بات زباں پر لا کے دیکھو تم پچھتاؤ گے

آج یہ جن دیواروں کو تم اُونچا کرتے جاتے ہو
کل کو ان دیواروں میں خود گھٹ کے مر جاؤ گے

ماضی کے ہر ایک ورق پہ سپنوں کی گلکاری ہے
ہم سے ناتہ توڑنے والو کتنے نقش مٹاؤ گے

ہاتھ چُھڑا کے چل تو دیئے ہو لیکن اتنا یاد رکھو
آگے ایسے موڑ ملیں گے سائے سے ڈر جاؤ گے

تم کو آدم زاد سمجھ کے ہم نے ہاتھ بڑھایا تھا
کس کو خبر تھی چھُوتے ہی تم پتھّر کے ہو جاؤ گے

دل سا مسکن چھوڑ کے جانا اتنا بھی آسان نہیں
صبح کو رستہ بھُول گئے تو شام کو واپس آؤ گے

جسم کے کچھ بے چین تقاضے ضبط سے باہر ہوتے ہیں
کب تک دل کو دھوکا دے کر یادوں سے بہلاؤ گے

○

اک بار ہی جی بھر کے سزا کیوں نہیں دیتے
گر حرفِ غلط ہوں تو مٹا کیوں نہیں دیتے

ایسے ہی اگر مونس و غمخوار ہو میرے
یارو مجھے مرنے کی دعا کیوں نہیں دیتے

اب شدّتِ غم سے مرا دم گھٹنے لگا ہے
تم ریشمی زلفوں کی ہوا کیوں نہیں دیتے

فردا کے دھندلکوں میں مجھے ڈھونڈنے والو
ماضی کے دریچوں سے صدا کیوں نہیں دیتے

موتی ہوں تو پھر سوزنِ مژگاں سے پرو لو
آنسو ہوں تو دامن پہ گرا کیوں نہیں دیتے

سایہ ہوں تو پھر ساتھ نہ رکھنے کا سبب کیا
پتھّر ہوں تو رستہ سے ہٹا کیوں نہیں دیتے

—

○

آنکھ برسی ہے ترے نام پہ ساون کی طرح
جسم سُلگا ہے تری یاد میں ایندھن کی طرح

لوریاں دی ہیں کسی قرب کی خواہش نے مجھے
کچھ جوانی کے بھی دن گزرے ہیں بچپن کی طرح

اس بلندی سے مجھے تُو نے نوازا کیوں تھا
گر کے میں ٹوٹ گیا کانچ کے برتن کی طرح

مجھ سے ملتے ہُوئے یہ بات تو سوچی ہوتی
میں ترے دل میں سما جاؤں گا دھڑکن کی طرح

اب زلیخا کو نہ بدنام کرے گا کوئی
اس کا دامن بھی دریدہ مرے دامن کی طرح

منتظر ہے کسی مخصوص سی آہٹ کے لیے
زندگی بیٹھی ہے دہلیز پہ برہن کی طرح

—

○

اس ہوش و خرد کی دنیا میں کہرام نہ جانے کتنے ہوں
ہم لوگ جو کچھ دل والے ہیں بدنام نجانے کتنے ہوں

فی الحال ہماری سادہ دلی تعزیر کے قابل ٹھہری ہے
کچھ اور جنوں بڑھ جانے پر الزام نجانے کتنے ہوں

اک تیری ذرا سی لغزش سے معلوم نہیں ساقی تجھ کو
جو ہاتھ سے گر کے ٹوٹ گئے وہ جام نجانے کتنے ہوں

خاموش نگاہی کے اپنی اب لاکھ فسانے بنتے ہیں
جب آنکھ سے آنسو ٹپکیں گے بدنام نہ جانے کتنے ہوں

وہ لوگ جنھوں نے خوں دے کر ہر پھول کو رنگت بخشی ہے
دو چار سے دنیا واقف ہے گمنام نجانے کتنے ہوں

جو خون کے آنسو پی پی کر ہر غم کو چھپائے پھرتے ہیں
اک میری طرح اس دنیا میں ناکام نجانے کتنے ہوں

—

○

تجدیدِ راہ و رسمِ وفا کر کے آئے ہیں
تھی اک متاعِ دل، سو فدا کر کے آئے ہیں

اپنی خطا ہے یہ، گرہ نیم باز کا
ناخن پہ جو تھا قرض ادا کر کے آئے ہیں

پتھّر سے ہمکلام رہے ہم تمام عمر
پانی پہ نقشِ لفظِ وفا کر کے آئے ہیں

ہاں ٹھیک ہے کہ موجبِ تعزیر ہیں ہمیں
دن کہہ سکے نہ شب کو خطا کر کے آئے ہیں

آنے کو آ گئے ہیں ترا قرب چھوڑ کر
ہم دل سے دھڑکنوں کو جُدا کر کے آئے ہیں

اب تو ہمارا ہاتھ عقیدت سے تھام لو
برسوں طوافِ کوئے وفا کر کے آئے ہیں

اب کیا کریں کہ وہ بھی کشیدہ ہمیں سے ہیں
جن کے لیے ہر اک کو خفا کر کے آئے ہیں

—

○

یہ تو مجھے معلوم نہیں، یہ منزل ہے یا جادہ ہے
اتنی خبر ہے شوقِ سفر اب پہلے سے بھی زیادہ ہے

چشمِ اشک فشاں! لے اب تو خون بھی دل کا ختم ہوا
اب بھی تجھ کو چین نہیں کیا اب کچھ اور ارادہ ہے

آج یہ جس کو دیکھ کے دنیا دیوانہ کہہ دیتی ہے
کون یہ جانے وہ بھی کسی کے سپنوں کا شہزادہ ہے

تپتی ریت، نکیلے کانٹے، راہیں اوجھل، منزل دور
میرا شوقِ آبلہ پائی، پھر بھی سفر آمادہ ہے

آپ کی لوحِ فکر گہِ محفوظ نقوشِ ماضی ہوں
یاد تو ہوگا آپ کا بھی اک ہمدم دور اُفتادہ ہے

ہے جو کیف جہدِ حیات میں وہ مجھے ملا ہے، تجھے نہیں
میں رہینِ رنج و الم سہی، تو غریقِ عیش و طرب سہی
مری خود سری کے خلاف ہے کسی چشمِ فیض کی التجا
تو مسیحِ دورِ رواں سہی، میں مریضِ روح بلب سہی

○

کاش بادل کی طرح پیار کا سایہ ہوتا
پھر میں دن رات ترے شہر پہ چھایا ہوتا

مجھ سی تخلیق کا الزام نہ آتا تجھ پر
میں اگر نقشِ غلط تھا، نہ بنایا ہوتا

خواب ٹوٹے تھے اگر تیرے بھی میری ہی طرح
بوجھ کچھ تیری بھی پلکوں نے اُٹھایا ہوتا

لمس ہاتھوں کا بھی کافی تھا پگھلنے کے لیے
موم کے بُت کو زمیں پر نہ گرایا ہوتا

راہ میں آگ کے دریا سے گزرنا تھا اگر
تو نے خوابوں کا جزیرہ نہ دکھایا ہوتا

وہ جو دوستی میں خلوص تھا، وہ رفاقتیں ہی نہیں رہیں
وہ جو دشمنی کے اصول تھے وہ عداوتیں ہی نہیں رہیں
کہاں جائیے پئے حق رسی، ہے عجیب عالمِ بے بسی
ہو غریبِ شہر بھی مدّعی، وہ عدالتیں ہی نہیں رہیں

○

ہر ایک راحت گنوا چکا ہوں نہ دن ہی اپنا نہ رات اپنی
متاعِ سوزِ دروں ہی یارو، بچی ہے کل کائنات اپنی

عجیب یہ دورِ آگہی ہے، نہ پرسشِ غم، نہ ربطِ باہم
کہ جیسے بہروں کی انجمن میں، ہر ایک کرتا ہے بات اپنی

تھکے ارادے، بجھے عزائم، لُٹے ہوئے قافلے خرد کے
لگائے سینے سے پھر رہا ہوں متاعِ زخمِ حیات اپنی

کسے سناؤں فسانۂ غم، نہ کوئی مونس، نہ کوئی ہمدم
ہر اک کو دنیا میں اپنے غم ہیں، ہر اک کو ہیں مشکلات اپنی

تجھے خبر یہ نہیں ہے پیارے، کہ کیسے ہم نے یہ دن گزارے
تری محبّت کے راستے میں، لُٹا کے کُل کائنات اپنی

جو تشنہ جاں، بہ لب ہوں یہ کیا کرتے ہیں کام آخر
کہ بڑھ کر چھینتے ہیں دوسرے ہاتھوں کے جام آخر

وہ شانِ کجکلاہی ہو، کہ شانِ دلربائی ہو!
ہر اک صبحِ درخشاں کی ہُوا کرتی ہے شام آخر

○

باتوں کا رس جو کان سے پہنچا زبان پر
کہرام مچ گیا مرے طرزِ بیان پر

اُن کو جو چاند کہہ کے پکارا تو ہنس دیے
کوئی تو تیر جا کے لگا ہے نشان پر

بارش اگر ہوئی ہے تو دریا کی گود میں
سورج اگر جھکا ہے تو اونچی چٹان پر

بادل کا جال لے کے میں اُڑتا تو کس طرح
ہر سمت روشنی کا تھا پہرہ اُڑان پر

کہنے کو یوں تو سارا فسانہ سُنا دیا
مطلب کی بات جم گئی نوکِ زبان پر

—

اے سحر کی روشنی کیا یہ خبر نہیں ہے تجھ کو
کوئی چاند چھپ گیا ہے تجھے زرنگار کر کے

○

اک بار گفتگو جو ہوئی ان سے دھیان میں
لکنت پڑی ہوئی ہے ابھی تک زبان میں

ماضی کی راکھ آپ کریدا نہ کیجیے
چنگاریاں دبی ہیں ابھی خاکدان میں

جب تک تھی سر پہ دھوپ تو منزل کی فکر تھی
سایہ ملا تو بیٹھ گئے درمیان میں

آنکھوں کو بند کر کے میں سنتا ہوں دل کی چاپ
شاید کہ آ سکے تری آواز کان میں

مانجھی ذرا سنبھال کے پتوار تھامنا
زلفوں کی بھر گئی ہے ہوا بادبان میں

پھیلے گی تیز دھوپ بھی ایامِ گل کے بعد
یہ بات بھی نہ تھی مرے وہم و گمان میں

میرا کمالِ شعر ہے فیضانِ غم شفقتؔ،
غم کی مٹھاس ہے مرے فن کی زبان میں

—

ہم ہی نہیں جو تیری طلب میں ڈیرے ڈیرے پھرتے ہیں
اور بہت سے خاک اُڑائے، بال بکھیرے پھرتے ہیں

پاس اگر سرمایۂ دل ہے، سائے سے ہوشیار رہو
ان راہوں میں بھیس بدل کر چور لٹیرے پھرتے ہیں

ہیں نے سنا ہے، صحرا پر بھی چھینٹا تو پڑ جاتا ہے
دیکھنا یہ ہے شومئی قسمت کب دن میرے پھرتے ہیں

راہِ خرد سے ممکن تھا آواز کو سن کر لوٹ آتے
راہِ جنوں پر جانے والے کس کے پھیرے پھرتے ہیں

تو نے کبھی تنہائی میں دو چار گھڑی یہ سوچا ہے
تیرے لیے ہم ٹھوکریں کھاتے سانجھ سویرے پھرتے ہیں

○

باتیں تری ڈوبی ہوئی جذبات کے رس میں
پھر کیسے کوئی دل کو رکھے ہوش کے بس میں

آندھی ہے گزر جائے گی کچھ دیر میں یارو
یہ گرد بھی دب جائے گی دو چار نفس میں

راہوں پہ مچلتی ہے کسی جسم کی خوشبو
شامل کوئی آواز ہے آوازِ جرس میں

مجبور کی دلجوئی کا سامان تو دیکھو
اک پھول بھی رکھا ہے ستمگر نے قفس میں

—

دیتے ہیں مشورہ مجھے ترکِ طلب کا لوگ
کہنے کو دوستی ہے مگر دشمنی کے ساتھ
ترکِ طلب کی بات نہیں زندگی کی ہے
تیری طلب رہے گی مری زندگی کے ساتھ

○

چین ہی نہ ملتا تھا جس کو ایک پل تنہا
زندگی گزرتی ہے، اس کی آج کل تنہا

میں بھی آج دنیا میں اس طرح اکیلا ہوں
جس طرح سے رہ جائے جھیل میں کنول تنہا

آپ کے تصوّر کا ساز چھیڑ کے اکثر
گنگنایا کرتا ہوں رات بھر غزل تنہا

تھک کے بیٹھنے والو مجھ کو دیکھ لو جس نے
آج تک نکالے ہیں زندگی کے بل تنہا

کارزارِ ہستی میں کون کس کا ساتھی ہے
ہم کو سوچنے ہوں گے مسئلوں کے حل تنہا

منزلیں لپک کے خود تیرے پاؤں چومیں گی
زندگی کی راہوں میں دو قدم تو چل تنہا

—

○

دُور سے میں نے ہر اک شخص کو سمجھا کچھ اور
پاس پہنچا تو نظر آیا تماشا کچھ اور

تو ہے بادل، میں جنم کا ہوں سُلگتا صحرا
گھر کے آیا ہے تو پھر کُھل کے برس جا کچھ اور

تو ملا بھی تو دورا ہے پہ بچھڑنے کے لیے
کاش بڑھ سکتا رفاقت کا یہ رستہ کچھ اور

سر پہ تلوار جدائی کی لٹکتی ہی رہی
ہم نے قربت کے تعلّق سے بھی سوچا کچھ اور

تیری تقصیر بھی کیا، تجھ سے شکایت کیسی
دوش میرا ہے کہ میں نے تجھے سمجھا کچھ اور

اپنی آنکھوں پہ یقیں تھا سو وہ دھوکا نکلا!
تو ہے کچھ اور، ترا چاند سا چہرہ کچھ اور

—

○

حالات ہیں پھر زیر و زبر دیکھیے کیا ہو
اِس دور میں انجامِ بشر دیکھیے کیا ہو

شب کاٹ تو لی تیرے تصوّر کے سہارے
اب حال مرا وقتِ سحر دیکھیے کیا ہو

جس راہ میں آغازِ سفر سوزشِ دل ہے
اس راہ میں انجامِ سفر دیکھیے کیا ہو

حالات دگرگوں ہیں اِدھر اہلِ وفا کے
تاثیرِ غمِ عشق اُدھر دیکھیے کیا ہو

جب فتنۂ انساں کی نظر سوئے فلک ہے
پھر مشغلۂ برق و شرر دیکھیے کیا ہو

اب کون نکھارے گا غزل خون سے اپنے
اب رنگِ روایاتِ جگر[1] دیکھیے کیا ہو

—

[1] جگر مرادآبادی مرحوم

○

نیرنگیٔ جذبات کو، تم ہم سے نہ پوچھو
خود دیکھ لو حالات کو، تم ہم سے نہ پوچھو

جو بات نگاہوں سے کبھی لب پہ نہ آئی
کیا بات ہے، اس بات کو تم ہم سے نہ پوچھو

کیوں آگ سلگتی رہی پہلو میں ہمارے
ہر تاروں بھری رات کو تم ہم سے نہ پوچھو

خود دیپ جلا کر اُسے پھونکوں سے بجھاؤ
اس شوقِ ملاقات کو، تم ہم سے نہ پوچھو

دیکھو جو جنم کا کلِ شب گیر کا عالم
پھر گردشِ حالات کو، تم ہم سے نہ پوچھو

—

چودھویں موسمِ گل کی ہے ذرا دھیان رکھو
آج ممکن ہے مرے گل کی سواری نکلے





مُرتضیٰ برلاس کے تیشۂ سخن نے کرب کے سینۂ کوہ سے یہ آبجُو برآمد کی ہے، اس کاوش میں تینوں صفات نمایاں ہیں، تیشے کی کاٹ، کوہ کی گرانی، آبجُو کی نغمگی، —— ادب کے نقار خانے میں ہر طوطی کی آواز کا سنائی دینا محال ہے لیکن اس کے باوجود کبھی کبھار کوئی ایسی آواز بھی بلند ہوتی ہے جو اپنے سوز و ساز اور جذب و خلوص کے سبب قلب و گوش تک پہنچ جاتی ہے، تیشۂ کرب ایک ایسی ہی آواز ہے، مجھے امید ہے کہ مرتضیٰ برلاس کا یہ کہنا سچ ہو کر رہے گا ؎

باتوں کا رس جو کان سے پہنچا زبان پر
کہرام مچ گیا مرے طرزِ بیان پر

فیض احمد فیض



